اسلام میں اجتماعیت کا مقام

انسانی فطرت اور اجتماعیت

جس طرح بچہ کے تصور کے ساتھ ماں کی گود کا تصور بھی آئے بغیر نہیں رہتا، اسی طرح انسانی زندگی کے ساتھ اجتماعیت کا تصور بھی لازماً آتا ہے۔ کوئی زمانہ ایسا نہیں پایا جاتا جب انسان اجتماعیت سے یکسر بے نیاز رہا ہو، چنانچہ تاریخ کے دھندلے سے دھندلے گوشوں میں بھی اس کے آثار ناپید نہیں۔ جب ''تمدن'' کی داغ بیل بھی نہیں پڑی تھی، جب انسان غاروں کے باہر بھی نہیں آسکا تھا، جب اس نے غلے اُگانے اور کپڑے بنانے کی بات بھی نہ سوچی تھی، جب درختوں کے سائے اور پھل پتے ہی اس کے لیے مدارِ حیات تھے، اس وقت بھی وہ خاندانوں کی شکل میں مل جُل کر رہتا تھا، اور اس اجتماعیت کو وہ اپنا گہوارۂ زندگی سمجھتا تھا۔ پھر جوں جوں اس کا ذوقِ تمدن اُبھرتا گیا، اور وسیع تر اجتماعیت کی رکاوٹیں چھٹتی گئیں، اس کی اجتماعیت پسندی پر بھی جلا آتی گئی۔ خاندانی اکائیاں قبائلی وحدت میں، اور پھر قبائلی وحدتیں قومی اجتماعیت میں تبدیل ہوتی گئیں، اور اب یہ قومی اجتماعیتیں ایک عائلی اجتماعی ادارے، بلکہ ایک بین الانسانی کنبے میں تحلیل ہو جانے کے لیے تیار ہو رہی ہیں۔

انسان کا یہ طرزِ عمل مسلسل کیوں چلا آرہا ہے؟ وہ پہلے ہی دن سے اجتماعیت کا طالب کیوں ہے؟ اور رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس کی یہ طلب کیوں بڑھتی اور نکھرتی گئی ہے؟ ان سوالوں کے جواب میں باتفاقِ رائے یہی کہا جائے گا کہ کچھ ایسے زبردست عوامل ضرور ہیں جو اسے اپنے دوسرے ابنائے نوع سے بے تعلق نہیں رہنے دیتے، جو اسے اندر ہی اندر مجبور کیے رکھتے ہیں کہ ان سے مل کر رہے، اور علیحدگی اور تنہائی کے بجائے ان کی معیت میں زندگی بسر کرے۔ اپنے اندر کی دنیا کا جائزہ لیجیے تو پائیں گے کہ یہ عوامل تعداد میں دو ہیں۔ ''ہم جنسی کی کشش'' اور ''تعاون کی احتیاج''۔

''ہم جنسی کی کشش'' سے مراد یہ ہے کہ انسان نفسیاتی طور پر اپنے ہم جنسوں سے ایک خاص انس رکھتا ہے، ان کے لیے اپنے اندر ایک گہری کشش پاتا ہے، ان کی معیت اور ہم نشینی میں ایک فرحت بخش سکون محسوس کرتا ہے، اور ان سے یکسر علیحدگی اُسے بے چین بنادیتی ہے اور مسلسل یا طویل تنہائی وحشت میں مبتلا کر دیتی ہے۔

''تعاون کی احتیاج'' کا مطلب یہ ہے کہ ایک طرف تو اس کی ذاتی اور انفرادی قوتیں حد درجہ محدود ہیں، دوسری طرف اُن کے مقابلہ میں اس کی دنیوی ضرورتیں حد درجہ بڑی اور وسیع ہیں، اس لیے یہ قوتیں ان ضرورتوں کے معاملہ میں ہرگز کافی نہیں ہوسکتیں اور وہ انھیں صرف اپنے ذاتی بل بوتے پر کسی طرح پورا نہیں کرسکتا، حتیٰ کہ جن ضرورتوں کو بالکل بنیادی اور ناگزیر ضرورتیں کہا جاتا ہے، ان کا پورا کر لینا بھی اس کے لیے اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ دوسرے بہت سے لوگ اس کی بلاواسطہ یا بالواسطہ مدد نہ کریں۔

اس طرح اجتماعیت انسان کی فطری طلب بھی ہے اور فطری ضرورت بھی۔ وہ دوسرے افرادِ انسان کی طرف ہم جنسی کے پیدائشی جذبہ کے تحت بے اختیار کھنچتا بھی ہے، اور اپنی دنیوی ضرورتوں کے تحت ان کا محتاج بھی بنا رہتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کی فطرت کی گہرائیوں میں اجتماعیت پسندی کی دو مضبوط جڑیں بالکل ساتھ ساتھ اُتری ہوئی ہیں۔ اس لیے اگر وہ اجتماعیت سے کبھی بے گانہ یا بے نیاز نہیں پایا گیا تو یہ ایک قدرتی بات تھی، اور انسان جب تک انسان ہے یہ بات اس کے لیے ہمیشہ قدرتی اور لازمی ہی رہے گی۔

یہ ایک ایسی مانی ہوئی حقیقت ہے جس کے بارے میں علم و دانش کے کسی دَور میں بھی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ دورِ قدیم کے مشہور یونانی عالم و فلسفی ارسطو نے انسان کی تعریف میں یہ الفاظ کہے ہیں:

''انسان پیدائشی طور پر ایک سیاسی حیوان ہے۔'' (ارسطو کی سیاسیات، ۱۲۵۳۔الف)

سیاست، ظاہر ہے کہ اجتماعیت ہی کی آخری شکل کا دوسرا نام ہے۔ اس لیے ''سیاسی حیوان'' کے معنی ہوئے وہ حیوان جو آخری اور انتہائی حد تک اجتماعیت پسند واقع ہوا ہو۔ گویا ارسطو کے

نزدیک انسان کی وہ خاص صفت، جو اسے حیوانات سے الگ اور ممتاز کرتی ہے، اس کی یہی آخری درجہ کی اجتماعیت پسندی ہی ہے۔ اس کے اندر اگر یہ صفت نہ ہوتی تو وہ بھی من جملہ دوسرے حیوانوں کے فقط ایک حیوان ہوتا۔

وسطی دَور کے معروف عالم اور محقق علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں کہ:

''افرادِ انسانی کا اکٹھے مل کر رہنا سہنا ایک ناگزیر بات ہے، اور یہی وہ حقیقت ہے جسے اہلِ علم و دانش اس طرح بیان کرتے ہیں کہ انسان پیدائشی طور پر مدنیت پسند واقع ہوا ہے''

(مقدمہ ابن خلدون)

جہاں تک موجودہ دَور کے علما اور فلاسفہ کا تعلق ہے، اُن کے یہاں تو یہ بات ایسی مسلمہ حقیقتوں کی صف میں شامل ہو چکی ہے جو کسی بحث یا ثبوت کی بالکل محتاج نہیں ہوتیں۔

قرآن مجید علم النفس یا علم الاجتماع کی کتاب نہیں کہ اس میں انسان کے جذبۂ اجتماعیت کے متعلق کوئی براہِ راست گفتگو پائی جاسکے۔ لیکن اس کے باوجود اپنے دائرۂ بحث میں وہ جو کچھ کہتا ہے اس کے پیچھے چونکہ دوسری بہت سی علمی حقیقتوں کی طرح انسانی نفسیات کے حقائق بھی ملحوظ رہتے ہیں، جیسا کہ ملحوظ رہنا چاہیے، اس لیے ضمناً اُن حقائق کی طرف بھی اس نے واضح اشارے کیے ہیں۔ ان اشارات کا جائزہ لیجیے تو صاف محسوس ہوگا کہ قرآن حکیم بھی انسانی فطرت کو اجتماعیت پسند ہی قرار دیتا ہے۔ مثلاً جب وہ یہ فرماتا ہے کہ نوعِ انسانی کی دونوں صنفوں میں ان کے خالق نے باہمی محبت اور رحم دلی پیدا کر رکھی ہے **وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً** (سورۂ روم:۲۱) تو گویا بالواسطہ وہ یہی کہتا ہے کہ انسان بنیادی طور پر اجتماعیت کا دل دادہ پیدا کیا گیا ہے۔ اسی طرح آخرت کی خوش کامیوں اور جنت کی نعمتوں کی تفصیل بیان کرتے وقت جب وہ اہلِ جنت کی ہم نشینی، ہم طعامی اور ہم کلامی کا بھی تذکرہ ضروری سمجھتا ہے[1]، تو گویا اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ

---

[1] مثلاً اخوانا علی سُرُرٍ مُتَقٰبِلِيْنَ۔ (سورۂ حجر:۴۷)

''جنت والے بھائیوں کی طرح تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔''

يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهَا كَاْسًا .... وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ۔ (سورۂ طور:۲۳۔۲۵)

''وہ جنت میں شراب بھرے پیالوں کی چھینا جھپٹی کریں گے .... اور ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر آپس میں باتیں کریں گے۔''

اجتماعیت انسانی فطرت کی ایسی عزیز طلب ہے جس سے وہ دنیوی زندگی میں کیا، آخرت کی زندگی میں بھی اونچی نہیں ہوسکتی، اور وہاں بھی انسان کی تسکینِ خاطر اور تکمیل مسرت اسی وقت ہوگی جب کہ اسے اپنی جنس کے دوسرے افراد کی رفاقت اور مصاحبت میسر ہو۔

اِسلام، دینِ فطرت

انسانی فطرت کا یہ رُخ اپنے سامنے رکھیے۔ اس کے بعد اس امر کی تحقیق کیجیے کہ انسانی فطرت کے مطالبوں کو اسلام کیا حیثیت دیتا ہے؟ تاکہ قیاسی اور اُصولی طور پر اس بات کا فیصلہ ہوسکے کہ اسلامی نظامِ فکر وعمل میں اجتماعیت اور اس کے عملی تقاضوں کو کوئی جگہ ملنی چاہیے یا نہیں؟

انسانی خلقت کے بارے میں قرآن مجید کا فرمانا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے نفس (قلب) کا ''تسویہ'' کیا ہے۔

وَنَفسٍ وَّمَا سَوّٰهَا (سورۃ الشمس: ۷)

''تسویہ'' کے معنی، لُغت میں کسی چیز کو خوب درست کرنے کے ہوتے ہیں۔ دوسری جگہ اسی بات کو اس نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے کہ ہم نے انسان کو 'احسن تقویم' میں پیدا کیا ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ. (سورۃ التین: ۴)

''تقویم'' کے معنی سیدھا کرنے کے ہوتے ہیں، اور جب کسی چیز کے باطن اور اس کی صفات کو بھی سامنے رکھ کر اس لفظ کا استعمال کیا گیا ہو تو اس وقت قدرتی طور پر اس کا مطلب اس چیز کو کسی خاص مقصد کے لیے موزوں و مناسب بنانا ہوتا ہے۔ اس لیے انسان کو 'احسنِ تقدیم' میں پیدا کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اسے ایسی ساخت عطا کی گئی ہے جو اس کے مقصدِ وجود کے لحاظ سے بہترین ساخت ہوسکتی تھی۔ ان وضاحتوں کے پیشِ نظر انسان کا ''تسویہ'' کرنے یا اسے ''احسن تقویم'' میں پیدا کرنے کا واضح مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جس مقصد سے پیدا کیا ہے اور اسے دنیا میں جو فریضہ انجام دینے کے لیے بھیجا ہے، ٹھیک اسی کے حسب حال اور حسبِ ضرورت اس کی فطرت بھی اس نے بنائی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس مقصد اور فریضہ کی انجام دہی

کے لیے جن قوتوں اور صلاحیتوں کی اسے ضرورت تھی، اور جن رُجحانات ومیلانات سے اس کا خمیر اٹھایا جانا چاہیے تھا، ان میں سے کسی ایک قوت یا کسی ایک رجحان سے بھی اسے محروم رکھا گیا ہو، یا ان قوتوں اور رجحانوں کے علاوہ کچھ زائد قوتیں اور رجحانات بھی اس کے اندر پیدا کر دیے گئے ہوں۔

ایک طرف تو انسانی فطرت کی حیثیت اسلام کی نگاہ میں یہ ہے۔ دوسری طرف اس دین کا کہنا یہ ہے کہ مَیں، اور صرف مَیں ہی، وہ شاہراہ ہوں جس پر چل کر انسان اپنے مقصدِ وجود کو ٹھیک ٹھیک پورا کر سکتا اور اپنے فریضۂ حیات کو صحیح طور پر بجا لا سکتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ عقل کا بدیہی تقاضا ہوگا کہ اسلام انسانی فطرت کو ذرا بھی نظر انداز نہ کرے، بلکہ اس کی بنیاد ٹھیک اسی فطرت پر ہو، اور اس کی تعلیمات دراصل اسی فطرت کے مجمل تقاضوں کی تفصیل اور اسی کی مبہم صداؤں کی توضیح ہوں۔ کتاب الٰہی اور ارشاداتِ رسولؐ سے معلوم ہوتا ہے کہ عقل کا یہ تقاضا غلط نہیں۔ حقیقت واقعی یہی ہے کہ اسلام انسانی فطرت کو بال برابر بھی نظر انداز نہیں کرتا، اور اس کی بنیاد کا ملاً اُسی فطرت پر قائم ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا، فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا. (سورۂ روم: ۳۰)

"ہر طرف سے کٹ کر اپنے رُخ کو اس دین کی طرف سیدھا کر لو۔ اللہ کی (بنائی ہوئی) اس فطرت کی پیروی کرو جس پر اس نے (تم) انسانوں کو پیدا کیا ہے۔"

یہ اس حقیقت کا واضح اعلان ہے کہ اسلام کی بنیاد جس شے پر رکھی گئی ہے وہ وہی فطرت ہے جس پر انسان پیدا کیا گیا ہے۔

قرآن حکیم نے اپنے کو، یا یوں کہیے اسلام کو، جا بجا 'ذکر'، 'تذکرہ' اور 'ذکریٰ' کہا ہے، جس کے لغوی معنی یاد دہانی کے ہیں۔ قرآن یا اسلام کے 'یاد دہانی' ہونے کا مطلب یہ ہے، اور یہی ہو سکتا ہے، کہ وہ کوئی ایسی چیز نہیں جو انسان پر کہیں سے لا کر لاد دی گئی ہو، اور جس سے وہ یکسر اجنبی رہا ہو، بلکہ ایک ایسی چیز ہے جس کی بنیادیں اس کے اندرون میں روزِ اوّل سے موجود ہیں، وہ اس کی فطرت ہی کی خاموش آواز ہے، جسے الفاظ کے اندر منتقل کر کے اس کے سامنے رکھ دیا گیا ہے،

اس خاموش آواز کو سن نہیں رہا تھا اور اپنے اندر کی موجود اس حقیقت کو وہ بھلا چکا تھا، رحمتِ حق نے اس بھلائے ہوئے سبق کو اسے یاد دلایا ——— اسلام کی یہی وہ حیثیت ہے جس کے پیشِ نظر وہ اپنے انکار کو "کفر" سے تعبیر کرتا ہے۔ کفر کے لغوی معنی ہیں 'چھپا دینا'۔ گویا اسلام کا انکار دراصل اپنی اُس فطرت کو چھپا دینا اور اس کے رُخِ زیبا پر حق ناپسندی کی سیاہ نقاب ڈال دینا ہے جس پر انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔ اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ اِلاَّ عَلَی الْفِطْرَۃِ (اِسْلام) فَاَبَوَاہُ یُھَوِّدَانِہٖ اَوْیُنَصِّرَانِہٖ اَوْیُمَجِّسَانِہٖ۔ (بخاری)

"کوئی بچہ نہیں جو فطرت اسلام پر نہ پیدا کیا گیا ہو، لیکن (اکثر و بیشتر ہوتا یہ ہے کہ) اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں"

یعنی فطرت انسانی کو ربط و مناسبت صرف اسلام سے ہے۔ ہر بچہ بڑا ہونے پر اسلام ہی کو اختیار کرتا اگر اس سلسلہ میں باہر سے کوئی مداخلت نہ ہوتی۔ لیکن یہ مداخلت بالعموم لازماً ہوتی ہے، اور وہ اس طرح کہ اس کے والدین اس کے دل و دماغ پر پالنے ہی سے اپنے مذہب کی پالش چڑھانے لگتے ہیں۔ اس لیے بڑا ہوتے ہوتے وہ یہودی یا نصرانی یا مجوسی یا کسی اور قسم کا نامسلم بن کر رہ جاتا ہے۔ ورنہ اگر کسی بچے کے بارے میں یہ مداخلت نہ ہو، اس کے ماحول کی غیر معمولی طاقت اسے کسی طرف کھینچ نہ لے جائے، اور اس کی اصل فطرت کو اپنی پیدائشی حالت پر آزاد باقی رہنے دیا جائے، اور پھر اس کے سامنے مختلف مذاہب کی تعلیمات ایک ساتھ پیش کی جائیں تو وہ ان تمام میں سے صرف اسلام کو اپنائے گا، مذاہب کے اس مجموعے میں جب اس کی نظر اسلام پر پڑے گی تو وہ اس کی طرف اس طرح جا لپکے گا جس طرح ایک بچہ بہت سی عورتوں کے درمیان صرف اپنی ماں کی طرف لپکتا ہے۔ ایسا اس لیے ہوگا کہ ہر دوسرا مذہب انسانی فطرت کی شاہراہ سے ہٹا ہوا ہے۔ اس لیے جس کسی کی فطرت کو والدین کی تعلیم و تربیت اور ماحول کے اثر نے ہاتھ نہ لگایا ہو وہ ان مذاہب میں اپنے لیے کوئی کشش نہ پائے گا، بلکہ ان سے بے گانگی اور اجنبیت

محسوس کرے گا۔ البتہ اسلام کی طرف کھنچ آئے گا، کیونکہ اسے وہ اپنی فطرت کے عین مطابق پائے گا۔ اس سے گہرا اُنس اور اک جان نواز ہم آہنگی محسوس کرے گا۔ گویا اس کی فطرت اگر خالص فولاد ہے تو اسلام اس کے لیے مصفّٰی مقناطیس ثابت ہوگا۔

ان نصوص اور دلائل کی روشنی میں اس حقیقت پر کوئی پردہ نہیں رہ جاتا کہ اسلام فطرت کا ترجمان ہے اور اس کی بنیاد اسی فطرت پر رکھی گئی ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اس بات کی صراحت فرمادی ہے کہ ''وہ فطرت جس پر انسان کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اس کا یہی دین ہے۔'' **فطرة الله التی فطر الناس علیها دین الله تعالیٰ۔**

(روح المعانی، جز ۲۱، صفحہ ۴۰)

دین فطرت ہونے کا واضح تقاضا

اگر اسلام دین فطرت ہے اور اس کی بنیاد ٹھیک انسانی فطرت پر قائم ہے، اور اگر انسان کی فطرت میں صرف وہی قوتیں اور رجحانات پیدا کیے گئے ہیں جن کا ان کے مقصدِ وجود نے زبانِ حال سے مطالبہ کیا تھا، تو ان دونوں باتوں کا یہ لازمی اور بدیہی تقاضا ہوگا کہ اسلام انسان کی کسی بھی فطری قوت یا رجحان کے کچل ڈالنے کا روادار نہ ہو، کسی کو اپنی راہ کا روڑا نہ سمجھے، کسی کے جائز تقاضوں کو نہ ٹھکرائے، اور کسی سے خدمت لینے میں کوتاہی نہ کرے۔ کیونکہ اس کے لیے ایسا کرنا اگر صحیح ہوسکتا ہے تو صرف اس وقت جب کہ اُسے تین باتوں میں سے کوئی نہ کوئی بات ضرور تسلیم ہو۔ یا تو یہ بات کہ اس کی بنیاد ٹھیک ٹھیک انسانی فطرت پر نہیں ہے۔ یا یہ بات کہ انسانی فطرت میں اس کے خالق نے کچھ ایسی چیزیں بھی پیدا کر رکھی ہیں جو انسان کے مقصدِ وجود کے لیے یکسر غیر ضروری بلکہ ضرر رساں ہیں۔ یا پھر یہ بات کہ وہ انسان کو ادائے فرض اور سچی کامیابی کی صراطِ مستقیم دکھلانے آیا ہی نہیں ہے —— لیکن جب وہ ان میں سے کسی بات کے بھی تسلیم کرنے پر تیار نہیں، بلکہ انھیں دنیا کی سب سے زیادہ غلط اور جھوٹی باتیں قرار دیتا ہے، تو ایسی حالت میں عقل یہ کہنے پر مجبور ہوگی کہ پھر تو اسلام کا رویہ ایک ایک قوت و رجحانِ فطرت کے بارے میں لازماً مثبت اور تعمیری ہونا

چاہیے، اور ضروری ہے کہ ان سب کا وہ احترام کرے، ان کے جائز مطالبات کو تسلیم کرے، انسانی زندگی کے حقیقی مقصد کے حصول میں انھیں کارآمد سمجھے، اور ان سے کام لینے کی ہدایت کرے۔

جس شخص کی بھی نگاہ اسلامی تعلیمات پر سطحی نہ ہوگی وہ شہادت دے گا کہ اسلام کا رویہ، عقل کے اس فیصلے سے ذرا بھی مختلف نہیں۔ وہ انسان کی ساری فطری قوتوں اور رجحانات کو بالیقین یہی حیثیت دیتا ہے، انھیں ہر لحاظ واحترام کا مستحق ٹھیراتا ہے، ان کے تقاضے پورے کرنے کی ہدایتیں دیتا اور اس کے لیے راہیں متعین کرتا ہے، اور اس بات کی شدت سے مخالفت کرتا ہے کہ انھیں معیوب سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے۔ پھر اس کا یہ رویہ اور یہ طرز فکر ان قوتوں اور رجحانوں کے ساتھ کسی رعایت کی خاطر اور کسی منفی بنیاد پر نہیں ہے۔ وہ محض اس وجہ سے ان کی پذیرائی نہیں کرتا کہ جب انسان یہ 'علّتیں' ساتھ لے کر پیدا ہوا ہے تو کچھ ان کی بھی مان لی جائے۔ بلکہ ٹھیک اپنے تصور دین کے تحت ایسا کرتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ قوتیں اور یہ رجحانات ایسے ذرائع ہیں جن سے ٹھیک ٹھیک کام لے کر ہی انسان اپنے مقصدِ وجود کو حسن وخوبی کے ساتھ پورا کر سکتا ہے۔ اور اسی لیے وہ ان کے مطالبات کی صحیح بجا آوری کو دنیا کا نہیں، بلکہ دین کا کام اور عبادت کا فعل قرار دیتا ہے۔ مثال کے طور پر انسان کے اندر کھانے پینے کی، جسمانی آرام وسکون کی، بقائے نسل کی، بیوی بچوں کی پرورش ونگہداشت کی، احباب کی خاطر مدارات کی فطری خواہشیں موجود ہیں۔ اسی طرح وہ غصہ، نفرت، سختی، جنگ، شہوت، گویائی، احساسِ مسرت اور احساسِ غم کی قوتیں لے کر پیدا ہوا ہے۔ بظاہر دیکھیے تو یہ ساری چیزیں دین اور دین داری کے ذوق سے کوئی میل نہیں کھاتیں، بلکہ ان میں سے بیش تر تو ایسی ہیں جو اس کے عین ضد کہی جائیں گی۔ مگر اسلام کہتا ہے کہ ——
نہیں، یہ سب انسانی فطرت کے جوہر ہیں، اور ان میں سے کوئی چیز بھی بے قیمت یا بلا ضرورت نہیں۔ انسان پر جس طرح اس کے خالق اور پروردگار کے حقوق ہیں، اسی طرح اس کے اپنے نفس کے، اپنے جسم کے، اپنی آنکھوں کے، اپنے اہل وعیال کے، اور اپنے احباب کے بھی حقوق ہیں، اور ضروری ہے کہ ان سارے حقوق کو ادا کیا جائے۔

اِنَّ لِجَسَدِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَّاِنَّ لِعَیْنِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَّاِنَّ لِزَوْجِکَ عَلَیْکَ حَقًّا. (بخاری کتاب الصوم)

''تیرے جسم کا تجھ پر حق ہے اور تیری آنکھ کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے۔''

اِنَّ لِرَبِّکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَّلِنَفْسِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَّ لِاَھْلِکَ عَلَیْکَ حَقًّا.

(بخاری کتاب الصوم)

''تیرے رب کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیرے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیرے گھر والوں کا بھی تجھ پر حق ہے۔''

اِنَّ لِرَبِّکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَّلِنَفْسِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَّ لِاَھْلِکَ عَلَیْکَ حَقًّا فَاَعْطِ کُلَّ ذِیْ حَقٍّ حَقَّهٗ. (بخاری کتاب الصوم)

''تیرے رب کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیرے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیرے گھر والوں کا بھی تجھ پر حق ہے، پس ہر حق دار کو اس کا حق دے۔''

حتیٰ کہ خود اپنی ذات کے اُوپر اور اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنا بھی کارِ ثواب ہے۔

اِبْدَءْ بِنَفْسِکَ فَتَصَدَّقْ عَلَیْهَا. (مسلم کتاب الزکوٰۃ)

''اپنے نفس سے شروع کر اور اس پر صدقہ کر۔''

مَھْمَا اَنْفَقْتَ فَھُوَلَکَ صَدَقَةٌ حَتَّی اللُّقْمَةَ. تَرْفَعُهَا فِیْ فِی امْرَاَتِکَ.

(بخاری کتاب النفقات)

''جو بھی تو نے خرچ کیا وہ صدقہ میں شمار ہوگا، حتیٰ کہ جو تیری بیوی نے کھایا وہ بھی صدقہ میں شمار ہوگا۔''

جو شخص جوشِ ریاضت میں آکر مسلسل روزے رکھتا رہے گا وہ ایسا غلط کار ٹھیرے گا گویا اس نے روزے رکھے ہی نہیں۔

لَا صَامَ مَنْ صَامَ الْاَبَدَ. (بخاری کتاب الصوم)

نکاح کرنا ہی دین کا تقاضا ہے اور اس سے اعراض کرنے والا رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے

تعلق رکھنے کا مستحق نہیں۔

اَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ فَمَنْ رَّغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ. (بخاری کتاب النکاح)

انسان میں اولاد کی طلب ہونی چاہیے۔

وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ. (سورۂ بقرہ: ۱۸۷)

تَزَوَّجُوا الْوَدُوْدَ الْوَلُوْدَ. (ابوداؤد، کتاب النکاح)

مثالی مومنوں، یعنی انبیا علیہم السلام کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ صاحب اہل وعیال تھے۔

وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً. (سورۃ الرعد، ۳۸)

مومن کے لیے ازدواجی وظیفے کی ادائی میں بھی اجر وثواب ہے۔

فِیْ بُضْعِ اَحَدِكُمْ صَدَقَةٌ. (مسلم، کتاب الزکوۃ)

حق اور دین کے معاملے میں اپنے موقع پر بغض اور نفرت کمال ایمان کی ضروری علامت ہے۔

مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَاَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ.

(مشکوۃ، صفحہ ۱۴، بحوالہ ابوداؤد)

اگر دین کی حفاظت اور حمایت کا تقاضا ہو تو اس کی خاطر جنگ بہترین نیکی ہے۔

قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَیُّ النَّاسِ اَفْضَلُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُؤْمِنٌ يُجَاهِدُ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِنَفْسِهٖ وَمَالِهٖ. (بخاری، کتاب الجہاد)

اور اس قسم کی جنگ کے جذبے سے اگر کوئی سینہ خالی ہے تو وہ ایک سچے مسلمان کا سینہ نہیں ہوسکتا۔

مَنْ مَّاتَ وَلَمْ يَغْزُ وَلَمْ يُحَدِّثْ بِهٖ نَفْسَهٗ مَاتَ عَلٰى شُعْبَةٍ مِّنْ نِّفَاقٍ۔[1]

کفر اور نفاق کے معاملے میں نرمی کا نہیں، بلکہ سختی کا رویہ ایمان کی جان ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ. (سورۂ فتح: ۲۹)

---

[1] جو شخص اس حال میں فوت ہوا کہ نہ اُس نے جہاد کیا اور نہ جہاد کا خیال ہی اس کے دل میں پیدا ہوا، وہ نفاق پر مرا۔ (مسلم جلد ۲)

''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، اور جو لوگ اس کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت ہیں اور آپس میں رحم دل اور نرم ہیں۔''

قوتِ گویائی کو معطل کیے رہنا اسلام کا نہیں، جاہلیت کا کام ہے۔

اِنَّ هٰذَا لَا يَحِلُّ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الْجَاهِلِيَّةِ. (بخاری، جلد دوم)

اپنے بچوں کو پیار کرنا ایک پسندیدہ عادت اور دینی ذوق کی بات ہے اور اپنے کو اس سے ''بلند'' رکھنا سخت ناپسندیدہ رویہ ہے۔

قَبَّلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْحَسَنَ بْنَ عَلِيٍّ ...... فَقَالَ مَنْ لَّا يَرْحَمُ لَا يُرْحَمُ. (بخاری کتاب الآداب)

اپنے کسی عزیز کی موت پر غمگین ہونا اور آنسو بہانا کوئی غیر مستحسن فعل نہیں، بلکہ انسانیت و رحم دلی کا مظاہرہ ہے۔

......هٰذِهٖ رَحْمَةٌ جَعَلَهَا اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِ عِبَادِهٖ. (مسلم، کتاب الجنائز)

یہ ساری شہادتیں اس بات کو قطعی طور پر ایک روشن اور ناقابل انکار حقیقت ثابت کر دیتی ہیں کہ اسلام فطری قوتوں اور میلانوں کو معیوب قرار نہیں دیتا، بلکہ معیوب اس بات کو قرار دیتا ہے کہ انھیں اچھی نظروں سے نہ دیکھا جائے، انھیں ٹھکرایا جائے، اور اُن کے حرکت میں آنے کو دین داری کے خلاف سمجھا جائے۔ وہ اسی خالقِ حکیم کی طرف سے آیا ہوا دین ہے جس نے انسان کو اور اس کی ساری فطری قوتوں کو خلق کیا ہے۔ اس لیے اس کے لیے یہ کسی طرح ممکن تھا ہی نہیں کہ وہ ان میں سے کسی ایک قوت کو بھی بے کار اور فضول قرار دیتا۔ دین اللہ اور دین فطرت ہونے کی حیثیت سے بنیادی طور پر اس کا تو مقصد وجود ہی یہ ہونا چاہیے کہ انسان کی فطری قوتوں اور رجحانوں سے کام لینے میں اس کی رہنمائی کرے، اسے ان کے غلط استعمال سے روکے اور صحیح استعمال کے طریقے بتائے، نہ صرف طریقے بتائے بلکہ اس کی تلقین بھی کرے۔ اور سچ پوچھیے تو یہی وہ سب سے بڑی مخصوص صفت ہے جو دین اللہ کو دوسرے دینوں سے اور اسلام کو غیر اسلام سے ممتاز کرتی ہے۔

جب اسلام، دین فطرت ہونے کے باعث، انسان کے ایک ایک فطری رجحان کو توجہ کے لائق ٹھیراتا ہے، اسے احترام کی نظر سے دیکھتا ہے، اس کے وجود کے پیچھے کسی نہ کسی مصلحت اور ضرورت کی کارفرمائی تسلیم کرتا ہے، اور اس بنا پر اس کے صحیح تقاضوں کی تکمیل کو اپنی تعلیمات میں لازماً جگہ دیتا ہے ــــــ تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک اجتماعیت پسندی ہی کے رجحان کو، جو بجائے خود انسانی فطرت کا بڑا ہی نمایاں اور قوی رجحان ہے، اس نے مذموم و مردود قرار دے دیا ہو یا اسے نظر انداز کر دیا ہو۔ یہ بات کسی طرح قیاس میں آنے والی نہیں۔ اس کے برعکس، قیاس کا کہنا تو صرف یہ ہے کہ اس نے انسان کے اس فطری رجحان کو بھی، اس کے مقصدِ وجود کے بارے میں، یقیناً ایک ضرورت کی چیز سمجھا ہوگا، اور اپنی تعلیمات کے اندر اس کے تقاضوں کو بھی وہی جگہ دی ہو گی جس کے وہ مستحق ہیں، نیز ایسے شخص کو اپنا ایک غلط کار پیرو ٹھیرایا ہوگا جو "مسلم" ہوتے ہوئے بھی اس کی اس طرح کی تعلیمات کو مناسب اہمیت نہ دے اور ان کا پورا پورا حق ادا کرنے سے کترا جائے ــــــ اور اگر امر واقعی یہ نہیں ہے، اگر اس نے اجتماعیت کے بارے میں یہ رویہ اختیار نہیں کیا ہے تو کوئی شک نہیں کہ عقل و انصاف کی عدالت اس پر بے اصولی اور تضاد پسندی کا شدید الزام لگائے گی، اور اس الزام کی صفائی میں اس کے لیے کچھ کہنا آسان نہ ہوگا۔

آیئے دیکھیں، اپنے دین فطرت ہونے کے اس واضح اصولی مطالبے کو اسلام نے کس حد تک تسلیم کیا ہے؟ اور اجتماعیت کو اس کے یہاں فی الواقع کیا مقام ملا ہوا ہے؟

اجتماعیت کی تسلیم شدہ دینی اہمیت

کتاب و سنت پر جائزے کی ایک اچٹتی نظر بھی اس بات کا یقین دلا سکتی ہے کہ اسلامی نظامِ فکر و عمل سے اجتماعیت کو بے دخل نہیں رکھا گیا ہے، بلکہ اس کی اہمیت کا صاف صاف اعتراف کیا گیا اور اس کے تقاضوں کو واضح طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ اور اگر جائزے کی نظر کو گہرائی میں اُتر کر کام کرنے کا موقع دیا جائے تو اس یقین کی وسعت کہیں سے کہیں جا پہنچے گی۔ دکھائی دے گا کہ اس نظام میں اجتماعیت کو وہ اہمیت حاصل ہے جو حیرت انگیز حد تک غیر معمولی ہے، جو شاید اپنی نظیر

آپ ہی ہے۔ کوئی پہلو نہیں جو اس اہمیت کو توضیح و تلقین کے لیے اختیار کیا جا سکتا ہو اور یہاں اسے اختیار نہ کیا گیا ہو، کوئی موقع نہیں جہاں اجتماعی طرزِ عمل اپنانے کی گنجائش نکل سکتی ہو اور اسلام نے اس کی تاکید نہ کر رکھی ہو۔

اس دعوے کی دلیل اور اس اجمال کی تفصیل ہمیں جن چیزوں سے ملے گی وہ یہ ہیں:

۱۔ اسلام کا عمرانی تصور، یعنی انسان کا وہ موقف جسے اس کا حقیقی عمرانی موقف تسلیم کر کے اسلام نے اسے خطاب کیا ہے۔

۲۔ وہ احکامِ شریعت جو اہلِ اسلام کی جماعتی تنظیم اور ملّی وحدت کے بارے میں وارد ہوئے ہیں۔

۳۔ وہ دینی ہدایات جن میں زندگی کے عام امور و معاملات کو بھی کسی نہ کسی طرح کے اجتماعی نظم کے ساتھ انجام دینے کی تلقین کی گئی ہے۔

۴۔ اجتماعیت کے وہ آداب جو فرض عبادتوں کے ضمن میں لازم ٹھیرائے گئے ہیں۔

آیئے، ایک ایک چیز کو لے کر اس کا تفصیلی مطالعہ کریں۔

(۱) عمرانی تصور کی زبان سے

کوئی بھی مذہب اپنے پیروؤں کو جب خطاب کرتا ہے تو اپنے ذہن میں انسان کی اصل حیثیت کا کوئی نہ کوئی تعین ضرور رکھتا ہے، اور اسے کسی متعین موقف پر رکھ کر ہی اپنی تعلیمات کا آغاز کرتا ہے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس سے گریز نہ ممکن ہے نہ صحیح۔ کیونکہ یہ چیز بھی انھی چند چیزوں میں سے ایک ہے جو مذاہب کے اندازِ خطاب کی، ان کے احکام و ہدایات کی، اور ان کی قدروں کی تعیین اور حد بندی کرتی ہیں، اور جن کا لحاظ اگر نہ رکھا جائے تو ان کی تعلیمات کے اندر نہ کوئی توازن پیدا ہو سکتا ہے نہ کوئی معقولیت پائی جا سکتی ہے۔

جن امور میں انسان کی اصل حیثیت اور اس کے قدرتی و حقیقی موقف کا تعین ضروری ہوتا ہے، اُن میں سے ایک عمرانیت بھی ہے۔ ہر مذہب کو یہ پہلے دن طے کر لینا پڑتا ہے کہ آیا انسان ایک ایسی مخلوق ہے جسے اپنی دنیا آپ بسانی اور تنہائی کی زندگی بسر کرنی ہے، یا اسے اپنے دوسرے

ہم جنسوں کے ساتھ اوران کے اندر رہنا سہنا ہے؟ اور اگر دوسروں کے ساتھ مل کر رہنا سہنا ہے تو اس میل جول کا دائرہ کتنا محدود یا کتنا وسیع، اور اس ربط کا رشتہ کتنا مضبوط ہے؟ قدرتاً اسلام نے بھی ان سوالوں کا ایک جواب متعین کر کے ہی انسان کو خطاب کیا ہے، اور اس معاملہ میں بھی اسے ایک خاص مقام پر رکھ کر ہی اس نے اپنی تعلیمات وضع کی ہیں۔ یہ جواب کیا ہے؟ اور اسلام کے نزدیک عمرانی پہلو سے انسان کا حقیقی مؤقف کیا ہے؟ یہ معلوم کرنے کے لیے ایک طرف تو اس کا یہ ارشاد سنیے:

يَآيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ.

(الحجرات:۱۳)

''لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے، اور تمھاری قومیں اور قبیلے بنائے ہیں۔''

دوسری طرف اس کا یہ عمل دیکھیے کہ اس کی شریعت پر اجتماعیت کی انتہائی گہری چھاپ پڑی ہوئی ہے، اس کے احکام و ہدایات کا ایک خاصا بڑا حصہ انسان کی اجتماعی زندگی کے لیے وقف ہے اور اس کی پیروی بھی اس نے اسی طرح لازمی قرار دی ہے جس طرح باقی دوسرے احکام کی، وہ جہاں حقوق اللہ سے بحث کرتا ہے وہیں حقوق العباد کو بھی پوری اہمیت سے لیتا ہے، وہ صرف پرستش کا طریقہ بتا کر خاموش نہیں ہو جاتا بلکہ اجتماعی زندگی بسر کرنے کے لیے ایک پورا نظامِ اطاعت بھی دیتا ہے، منزلی اور عائلی، شہری اور ملکی، اخلاقی اور معاشرتی، تمدنی اور معاشی، سیاسی اور بین الاقوامی، غرض حیاتِ انسانی کا کوئی شعبہ نہیں جس کے سلسلے میں اس کے احکام موجود نہ ہوں، اور زندگی کی کوئی گزرگاہ نہیں جہاں اس کے ہدایت نامے آویزاں نہ ہوں۔

یہ دونوں اُمور ——— اسلام کا یہ صریح ارشاد اور اس کا یہ واضح عمل ——— جس امرِ واقعی کا انکشاف کرتے ہیں وہ کسی بحث و استدلال یا کسی وضاحت سے یکسر بے نیاز ہے۔ یہ دونوں بجائے خود اس بات کا کھلا ہوا اعلان ہیں کہ اسلام نے انسان کو خطاب کرتے وقت ایک ایسے مقام پر رکھا ہے جسے اجتماعیت کا اونچا مقام کہا جائے گا۔ اس کی تعلیمات کے پس منظر میں انسان کا جو

مؤقف ایک مسلمہ حقیقی مؤقف کی حیثیت سے موجود ہے وہ قطعی طور پر ایک منظّم اجتماعی زندگی بسر کرنے والی مخلوق کا مؤقف ہے۔ وہ انسانی افراد کا اس کے سوا اور کوئی تصور رکھتا ہی نہیں کہ یہ ایک قبیلے، ایک قوم، اور ایک معاشرے کے اجزائے ترکیبی ہیں اور اپنے اسی ''کُل'' کے اجزا بن کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ گھربار، کھیت اور بازار، علمی ادارے اور تحقیقاتی مراکز، اسمبلی اور پارلیمنٹ، میدانِ جنگ اور ایوانِ صلح، ہر جگہ کی دبستگیاں اور ضرورتیں رکھتے ہیں۔ اس لیے جب بھی انھیں خطاب کرنا ہو ضروری ہے کہ ان کے اس مسلم اور حقیقی موقف کو سامنے رکھ کر خطاب کیا جائے۔

اگر اسلام انسان کو خطاب کرتے وقت اپنے ذہن میں اس کا عمرانی تصور یہ رکھتا ہے تو یہ اس بات کا بدیہی ثبوت ہے کہ وہ اپنے پیروؤں کے لیے اجتماعیت کو ایک امر لازم سمجھتا ہے، اور اس حد تک لازم سمجھتا ہے کہ اگر انسان کو اس کی اس حیثیت سے الگ کر دیا جائے تو پھر اس زمین پر اس کا کوئی صحیح مخاطب ہی باقی نہیں رہ جاتا۔

(۲) تنظیمی احکام کی زبان سے

کوئی شک نہیں کہ اسلام نے فرد کو بڑی اور بنیادی اہمیت دی ہے۔ فرد ہی اس کا ابتدائی اور حقیقی مخاطب ہے۔ جس طرح وہ تنہا پیدا ہوا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے احکام و مرضیات پر چل کر اپنی زندگی کو کام یاب بنانا بھی اسی کی اپنی انفرادی ذمہ داری ہے، اور کل اس کے حضور اپنے عمل کی جواب دہی کے لیے اسے اکیلے ہی حاضر بھی ہونا ہے ——— لیکن اسی کے ساتھ اس کا کہنا یہ بھی ہے کہ وہ راستہ جو انسان کو کامیابی کی منزلِ مقصود تک پہنچاتا ہے، اجتماع سے کترا کر نہیں جاتا، بلکہ ایک منظّم اجتماعی زندگی کے ٹھیک منجدھار سے ہو کر گزرتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید اس راستے کی تعیین کرتے ہوئے اس کے ضروری مراحل کے سلسلے میں فرماتا ہے کہ:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا .... وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا.

(آلِ عمران: ۱۰۲۔۱۰۳)

''اے ایمان والو...... اور تم سب کے سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور الگ الگ نہ رہو۔''

"الگ الگ نہ رہو" یعنی باہم جڑے ہوئے رہو۔ یہ "الگ الگ نہ رہنا" اور باہم جڑا رہنا، کس طرح کا اور کس مثعیار کا ہونا چاہیے، اس کی وضاحت کے لیے صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی طرف رجوع کیجیے۔ آپ فرماتے ہیں کہ:

عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ وَإِيَّاكُمْ وَالْفُرْقَةَ. (ترمذی، جلد۲، صفحہ۴۱)

"جماعت کے دامن کو مضبوطی سے تھامے رہو، اور انتشار سے پوری طرح الگ رہو۔"

اٰمُرُكُمْ بِخَمْسٍ بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ.

(احمد و ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ صفحہ ۳۲۱)

"میں تمھیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں: جماعتی زندگی کا، سمع (یعنی احکامِ امیر کے سننے) کا، طاعت (یعنی احکام کے ماننے) کا، ہجرت کا، اور جہاد فی سبیل اللہ کا۔"

ان حدیثوں سے معلوم ہوا کہ جس جماعتی زندگی کا حکم اسلام نے دیا ہے وہ کوئی ڈھیلی ڈھالی جماعتی زندگی نہیں ہے جس کی شیرازہ بندی صرف اخلاقی رشتوں سے ہوئی ہو، بلکہ ایسی متحد اور منضبط جماعتی زندگی ہے جس کو سمع اور طاعت کے آہنی تاروں سے بھی پوری طرح کس دیا گیا ہو۔

پھر یہی نہیں کہ 'جماعت' کے دامن کو مضبوطی سے تھامے رہنے اور جماعتی زندگی بسر کرنے کا یہ ایک لازمی حکم ہے، بلکہ یہ ایسا لازمی حکم ہے جس کی خلاف ورزی میں نہ ایمان کی خیر ہے نہ اسلام سے رشتہ برقرار رہ سکتا ہے۔ چنانچہ مزید ارشاد ہوتا ہے کہ:

اِنَّهٗ مَنْ خَرَجَ مِنَ الْجَمَاعَةِ قِيْدَ شِبْرٍ فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْإِسْلَامِ مِنْ عُنُقِهٖ.

(احمد و ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ: ۳۲۱)

"جو شخص 'الجماعۃ' سے بالشت بھر بھی الگ ہو رہا، کوئی شک نہیں کہ اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال پھینکا۔"

مَنْ خَرَجَ مِنَ الطَّاعَةِ وَفَارَقَ الْجَمَاعَةَ فَمَاتَ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً.

(مسلم جلد۲، صفحہ ۱۲۷)

"جو کوئی امام المسلمین کی اطاعت سے کنارہ کشی اختیار کرے گا اور جماعت المسلمین سے

الگ ہو رہے گا اور اسی حال میں مرجائے گا اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔''

جس طرح مسلمانوں کی 'الجماعۃ' سے اپنا جُڑا ہوا رشتہ کاٹ لینا ایمان کے منافی ہے اسی طرح اس نظمِ اجتماعی سے وابستہ نہ ہونا بھی دینی حیثیت سے انتہائی خطرناک حالت ہے:

مَنْ مَّاتَ وَلَيْسَ فِيْ عُنُقِهٖ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً. (مسلم جلد۲، صفحہ ۱۲۸)

''جو شخص اس حال میں مرجائے کہ اس کی گردن میں (امام المسلمین کی) بیعت (کا قلادہ) نہ ہو، اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔''

جس ''الجماعۃ'' کی حیثیت یہ ہو اور جس نظمِ اجتماعی سے علیحدگی یا بےتعلقی ایک مسلمان کو جاہلیت کی حالت میں پہنچا دیتی ہو، کوئی وجہ نہیں کہ اس کے اندر رخنہ ڈالنے کی کسی جسارت کو ایک لمحے کے لیے بھی برداشت کرلیا جائے۔ چنانچہ اس بارے میں آپؐ کی ہدایت یہ ہے کہ:

مَنْ اَرَادَ اَنْ يُّفَرِّقَ اَمْرَ هٰذِهِ الْجَمَاعَةِ وَهِيَ جَمِيْعٌ فَاضْرِبُوْهُ بِالسَّيْفِ كَائِنًا مَنْ كَانَ. (مسلم جلد۲، صفحہ ۱۲۸)

''جو شخص اس جماعت کو، جب کہ وہ متحد ہو، پراگندہ کرنا چاہے، اسے (بدرجۂ آخر) تلوار پر رکھ لو، خواہ وہ کوئی بھی ہو۔''

دوسری طرف قدرتی طور پر، ان لوگوں کا اجر اور مرتبہ قابلِ رشک حد تک عظیم قرار دیا گیا ہے جو اس نظمِ اجتماعی کی عملی شکل ــــــ اسلامی مملکت ــــــ کی حفاظت اور سالمیت کے لیے جاں بازی دکھائیں۔ فرمایا گیا ہے کہ:

''ایک شب و روز کی سرحدوں کی حفاظت ایک مہینے کے مسلسل روزوں اور نمازوں سے بھی افضل ہے۔ اور اگر اسی دوران میں کسی کی وفات ہو جائے تو اس کا وہ عمل نیک، جسے وہ اپنی زندگی میں انجام دیا کرتا تھا، برابر انجام پاتا ہوا شمار کیا جائے گا، اور اسے اس کا رزق ملتا رہے گا، نیز وہ فتنے میں ڈالنے والوں سے مامون رہے گا۔'' (مسلم جلد دوم، صفحہ ۱۴۲)

''دو آنکھوں کو دوزخ کی آگ نہ چھو سکے گی: ایک وہ جو خوفِ خدا سے رو پڑی ہو، دوسری

وہ جس نے رضائے الٰہی کی خاطر سرحدوں کی نگرانی کرتے ہوئے رات گزار دی ہو۔''

(ترمذی، جلد اول، صفحہ ۲۱۰)

اسی طرح اس نظم کی اطاعت کو ایمان کی ایک ضروری علامت بتایا گیا ہے، اور اصحاب امر کی فرماں برداری کو اللہ و رسولؐ کی فرماں برداری قرار دیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

مَنْ يُّطِعِ الْاَمِيْرَ فَقَدْ اَطَاعَنِىْ وَمَنْ يَّعْصِ الْاَمِيْرَ فَقَدْ عَصَانِىْ. (مسلم، جلد ۲، ص ۱۲۴)

''جس نے امیر کی فرماں برداری کی اس نے میری فرماں برداری کی، اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔''

'اطاعتِ امیر' کے اس فریضے کو امکان کی آخری حد تک انجام دینے کی تاکید کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ اُن اُمرا کی بھی بیعت اور اطاعت سے کنارہ کشی کی اجازت نہیں ہے جو بُرائیوں میں لت پت ہو رہے ہوں، اور جن کے ہاتھوں رعایا کی پیٹھیں زخموں سے چُور چُور ہو جاتی ہوں۔ حالانکہ یہ وہ حرکتیں ہیں جو اسلام کی نگاہ میں انتہائی حد تک مبغوض ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے پیروؤں سے کہتا ہے کہ صبر سے ان مظالم کو برداشت کیے جاؤ اور ان کی امارت کو چیلنج نہ کرو بلکہ معروف میں ان کی برابر اطاعت کرتے رہو۔ اس معاملے میں ایسی غیر معمولی چشم پوشی کی پالیسی اس نے کیوں اختیار کی ہے؟ اور ظالم و فاسق امرا کے بارے میں ایسے انتہائی صبر و انقیاد کا اس نے مسلمانوں کو حکم کیوں دیا ہے؟ محض اس لیے تاکہ ملت کی اجتماعیت محفوظ رہے اور مسلمانوں کا اتحاد، انتشار کی نذر نہ ہونے پائے۔ امام نوویؒ اس طرح کی حدیثوں پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

هٰذِه الاحاديث فى الحث على السمع و الطاعة فى جميع الاحوال و سببها اجتماع كلمة المسلمين فان الخلاف سبب لفساد احوالهم فى دينهم و دنياهم. (شرح مسلم، جلد ۲، صفحہ ۱۲۴)

''یہ حدیثیں اس امر کی تاکید کے بارے میں وارد ہوئی ہیں کہ اولوالامر کے احکام ہر حال میں سنے اور مانے جائیں، اور ان کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کا اتحاد برقرار رہے، کیونکہ اختلاف ان کے لیے دینی اور دنیوی دونوں قسم کی خرابی احوال کا موجب ہے۔''

یہ ان احکام کا ایک مجمل خلاصہ ہے جو اجتماعی نظم اور ملی اتحاد کے بارے میں اسلام نے اپنے پیروؤں کو دے رکھے ہیں۔ اگر صرف انھی چند ارشادات کو غور سے دیکھ لیا جائے تو اجتماعیت کی وہ قدر و قیمت، جو اسے اسلام میں حاصل ہے، بڑی حد تک بے حجاب نظر آ جائے گی۔ کتاب و سنت کی رُو سے اگر تمام اہل ایمان کا ایک خاص شیرازے (حَبلُ اللّٰہِ) میں بندھا رہنا اور 'تفرق' سے دُور رہنا ضروری ہے۔ اگر مسلمانوں پر نظامِ خلافت کا قائم کرنا واجب ہے[1] اگر امام المسلمین کی اطاعت اللہ اور رسولؐ کی اطاعت ہے، اگر جماعۃ المسلمین سے بالشت بھر کی علیحدگی بھی مومن کی گردن کو اسلام کے حلقے سے محروم کر دیتی ہے، اگر 'امام' کی بیعت سے بے نیاز مر جانا جاہلیت کی موت مرنا ہے، اگر الجماعۃ کے اتحاد میں رخنے ڈالنے والے کے خون کی کوئی قیمت نہیں، اور اگر ملت کے اجتماعی نظام (اسلامی مملکت) کی حفاظت سے بڑی کوئی عبادت نہیں ——— تو سوچیے، وہ کون سا مقام ہے جو اجتماعیت کو ملنا چاہیے تھا، لیکن اسلام میں اُسے ملا نہیں ہے۔

(۳) عام اجتماعی ہدایات کی زبان سے

''اجتماعیت'' اور ''اجتماعی نظامِ زندگی'' کے الفاظ جب بولے جاتے ہیں تو عام طور سے ان کا اُونچے سے اُونچا اور وسیع سے وسیع مفہوم بھی ایک باضابطہ نظامِ حکومت کے قیام سے زیادہ نہیں ہوتا۔ گویا عام معاشروں کی حد تک یہی اجتماعیت کا معیارِ مطلوب اور منتہائے کمال سمجھا جاتا ہے، اور حکومت کے دائرۂ عمل واثر سے باہر کی باقی پوری زندگی اجتماعیت کی بحث سے یکسر آزاد اور بے تعلق خیال کی جاتی ہے۔

• لیکن اسلام اس عام نقطۂ نظر سے اتفاق نہ کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے، اور اپنے پیروؤں کو، حکومتی دائرۂ عمل واثر سے باہر کی زندگی بھی، کسی نہ کسی طرح کے اجتماعی نظم کے ساتھ ہی بسر کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس سلسلے میں اس نے جو ہدایات دی ہیں ان کا ایک ترتیب سے مطالعہ کیجیے۔

(۱) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] نصبِ خلافت کے واجب ہونے پر اُمت کا اجماع ہے۔ اس مسئلے پر مفصل گفتگو ایک مستقل عنوان کے تحت آگے آتی ہے۔

لَا يَحِلُّ لِثَلَاثَةٍ يَكُوْنُوْنَ بِفَلَاةٍ مِّنَ الْاَرْضِ اِلَّا اَمَّرُوْا عَلَيْهِمْ اَحَدَهُمْ.

(المنتقی، صفحہ ۳۳۰)

"ایسے تین آدمیوں کے لیے، جو کسی بیابان میں ہوں، جائز صرف یہ بات ہے کہ وہ اپنے میں سے ایک کو اپنا امیر بنا کر رہیں۔"

یہ ارشاد نبویؐ کہتا ہے کہ اگر تین مسلمان بھی کسی جگہ ہوں، حتیٰ کہ اگر وہ کسی الگ تھلگ مقام پر اور سنسان بیابان ہی میں کیوں نہ آباد ہوں، تو بھی ضروری ہے کہ ان میں سے ایک ان کا امیر ہو اور باقی دو اس کے مامور و ماتحت ہوں۔ اس اجتماعیت اور تنظیم کے، بلکہ یوں کہیے کہ اس ننھے سے "ریاستی نظم" کے بغیر ان کی زندگی اسلامی زندگی نہ ہوگی۔

(۲) حضرت ابوسعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

اِذَا خَرَجَ ثَلٰثَةٌ فِیْ سَفَرٍ فَلْیُؤَمِّرُوْا اَحَدَهُمْ. (ابوداؤد، جلد ا، صفحہ ۳۵۱)

"جب تم میں سے تین آدمی (بھی) سفر کے لیے نکلیں تو چاہیے کہ ایک کو اپنا امیر بنالیں۔"

یعنی مسلمان کے لیے ہدایت یہ ہے کہ مدتِ سفر جیسا عارضی وقت بھی نظم و امر کے بغیر نہ گزارے۔ اگر تین اشخاص بھی ایک ساتھ سفر کر رہے ہوں تو مزاجِ اسلامی کے سراسر خلاف ہوگا اگر انھوں نے اپنے میں سے ایک کو اپنا امیر سفر نہ بنالیا ہو، اور اس کی سرکردگی میں وہ یہ سفر نہ کر رہے ہوں۔

(۳) حضرت ابوثعلبہ خشنیؓ کہتے ہیں کہ لوگوں کی عادت تھی کہ سفر کے دوران میں جب کہیں پڑاؤ ڈالتے تو اِدھر اُدھر پھیل جاتے اور اپنی اپنی پسند کی مختلف جگہیں ٹھیرنے کے لیے منتخب کر لیتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار یہ صورت حال دیکھی تو سرزنش کرتے ہوئے فرمایا:

اِنَّ تَفَرُّقَكُمْ فِیْ هٰذِهِ الشِّعَابِ وَالْاَوْدِيَةِ اِنَّمَا ذٰلِكُمْ مِنَ الشَّيْطَانِ.

(ابوداؤد، جلد اول، صفحہ ۳۵۴)

"تمھارا اس طرح مختلف گھاٹیوں اور میدانوں میں منتشر رہنا صرف شیطان کی وجہ سے ہے۔"

اس تنبیہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ:

''لوگ پھر کبھی اس طرح منتشر نہ ہوئے، اور جب کسی جگہ پڑاؤ ڈالتے تو ایک دوسرے سے بالکل لگ کر ٹھیرتے، حتیٰ کہ خیال ہوتا اگر انھیں ڈھکا جائے تو ایک ہی کپڑے کے نیچے سب آجائیں گے۔'' (ابوداؤد، جلد اول، صفحہ ۳۵۴)

معلوم ہوا کہ بغیر کسی جماعتی نظم کے پورا سفر کر ڈالنا تو درکنار، اس کے دوران میں چند گھنٹوں کا کوئی پڑاؤ بھی اگر اپنے اپنے طور پر کرلیا جائے تو اتنی سی دیر کی بھی زندگی شانِ اجتماعیت سے آراستہ دکھائی نہ دے سکے، تو یہ بات بھی اِسلام کو قطعی گوارا نہیں، اور اسے وہ شیطان کی پیروی قرار دیتا ہے۔

(۴) ایک صحابی کسی گھاٹی سے گزر رہے تھے۔ وہاں انھیں میٹھے پانی کا ایک چشمہ نظر آیا، جس نے انھیں اپنا گرویدہ بنالیا۔ دل نے کہا، کاش میں آبادی چھوڑ کر یہیں آبستا۔ اس خواہش کو لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور پہنچے اور اجازت طلب کی، تو آپؐ نے فرمایا:

''نہیں، ایسا نہ کرو، کیونکہ اللہ کی راہ میں تمھارا کھڑا رہنا گھر کے اندر پڑھی جانے والی تمھاری ستر برس کی نمازوں سے بھی افضل ہے۔''

لَا تَفْعَلْ فَاِنَّ مَقَامَ اَحَدِكُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَفْضَلُ مِنْ صَلٰوتِهٖ فِیْ بَیْتِهٖ سَبْعِیْنَ عَامًا. (ترمذی جلد اول)

یہ حدیث اس حقیقت کی عکاس ہے کہ اجتماعی زندگی کو چھوڑ کر تنہائی کی زندگی گزارنے میں چاہے جو بھی دینی اور دنیوی فوائد نظر آتے ہوں لیکن اسلام اپنے پیروؤں کو اُدھر جانے اور اجتماع سے کٹ کر رہنے کی اجازت نہیں دیتا۔ کیوں کہ یہ دینی اور دنیوی فوائد خواہ کتنے ہی عظیم کیوں نہ ہوں مگر ان فائدوں کے مقابلے میں بالکل ہیچ ہیں جو ایک منظّم اسلامی معاشرے کے اندر ایک مسلمان کو حاصل ہو سکتے ہیں۔

غور کیجیے، سفر اور حضر سے متعلق یہ مختلف دینی ہدایتیں اسلامی نظامِ فکر و عمل میں اجتماعیت کی ضرورت و اہمیت کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہیں! یہ یقیناً ایک ایسی حقیقت کا انکشاف کرتی ہیں

جس کوصرف اسلام ہی کے اندر موجود پایا جاسکتا ہے، اور جس سے دنیا کا ہر دوسرا معاشرہ اور نظام ناآشنا ہے۔ یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہیں کہ اسلامی زندگی کے اجتماعی تقاضے صرف احکام خلافت کی بجا آوری پر جا کر ختم نہیں ہو جاتے، بلکہ اس دائرے سے باہر کی عام زندگی کو بھی اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کے نزدیک اجتماعیت کی اہمیت انتہائی بلند ہی نہیں، انتہائی وسیع اور ہمہ گیر بھی ہے، حتیٰ کہ انسان کے عام رہن سہن کا کوئی گوشہ بھی اس کے حدود اثر سے آزاد نہیں۔ علامہ شوکانیؒ ان حدیثوں کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ حدیثیں اس بات کی دلیل ہیں کہ جہاں کہیں بھی تین یا تین سے زائد مسلمان ہوں ان کے لیے حکم شریعت یہ ہے کہ وہ اپنے میں سے ایک شخص کو اپنا امیر مختلف کرلیں۔ کیونکہ اسی طرح باہمی اختلاف سے محفوظ رہا جاسکتا ہے ——— اور اگر اُن تین افراد کے لیے بھی، جو کسی جنگل میں ہوں یا ایک ساتھ سفر کر رہے ہوں، حکم شریعت یہ ہے تو اس بڑی تعداد کے مسلمانوں کے لیے جو کسی گاؤں یا شہر میں ایک ساتھ رہتے ہوں یہ بدرجۂ اولیٰ مشروع ہوگا۔'' (نیل الاوطار، جلد۹، صفحہ ۱۵۷)

(۴) عبادتوں کے اجتماعی آداب کی زبان سے

انسانی زندگی کا وہ شعبہ، جسے عرفِ عام کے لحاظ سے عبادتی شعبہ کہنا چاہیے، ایک ایسا شعبہ ہے جہاں اجتماعیت کی رسائی کا تصور بھی مشکل سے کیا جاسکتا ہے۔ عبادتِ الٰہی کا نام لیجیے، ذہن آپ سے آپ گوشوں اور تنہائیوں کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ خیال ہونے لگتا ہے کہ عبادت خالصتاً دین کا اور آخرت کا کام ہے، کسی پہلو سے بھی دنیا کا کام نہیں، پھر اسے کسی طرح بھی سامان جلوت کیسے بنایا جاسکتا ہے! گھر کی، محلے کی، بستی کی، پورے ملک کی زندگیاں اجتماعی نظم کی محتاج ضرور کہی جاسکتی ہیں، مگر خدا کو یاد کرنے کے لیے بھی کسی اجتماعیت کی ضرورت محسوس کی جائے، یہ بات کچھ سمجھ میں آنے والی نہیں۔ یادِ الٰہی اور عبادت کی تو فطرت ہی گرد و پیش سے بے تعلقی چاہتی ہے۔ غرض عبادت گاہیں اور ریاضت کدے وہ مقامات ہیں جہاں ماسوا کا تصور بھی گوارا نہیں کیا

جاتا ـــــــ اب اگر کوئی دین، عبادات کے اندر کچھ اجتماعی آداب کو لازم ٹھیراتا ہے تو کہنا چاہیے کہ اس نے اجتماعیت کو اہمیت دینے میں سب سے آخری قدم اٹھا دیا ہے۔ ایسی حالت میں اس امر کا اندازہ لگانے کے لیے کہ اس دین میں اجتماعیت کو کس درجہ کی اہمیت ملی ہوئی ہے، اُن آداب اجتماعی سے زیادہ فیصلہ کن اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی جنھیں اس نے اپنی عبادتوں میں ملحوظ رکھنے کا حکم دے رکھا ہو۔ یہ آداب شمار میں جتنے ہی زیادہ ہوں گے، اور انھیں جتنا ہی زیادہ ضروری ٹھیرایا گیا ہوگا، کوئی شک نہیں کہ اس دین میں اجتماعیت کا حاصل شدہ مقام اتنا ہی اونچا قرار پائے گا۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، بالیقین وہ ایک ایسا ہی دین ہے جس کی عبادتوں میں اجتماعی آداب سموئے ہوئے ہیں۔ کس حد تک اور کس اہمیت کے ساتھ سموئے ہوئے ہیں؟ اس امر کا تفصیلی جائزہ ذیل کی سطروں میں ملاحظہ کیجیے:

ا۔ نماز:

اس سلسلے میں ہمیں قدرتی طور پر سب سے پہلے نماز کو لینا چاہیے۔ کیونکہ ساری عبادتوں میں وہ سب سے بڑی عبادت ہے، پورے دین کا مغز اور بندگی کا سرچشمہ ہے، اور اُسے اسلام کا شاہ ستون (عِمَادُ الدِّيْنِ) فرمایا گیا ہے۔ اس عبادت کو جن شرائط اور آداب کے ساتھ ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان میں یہ امور بھی شامل ہیں:

(الف) نماز ادا کرتے وقت ہر مسلمان کا رُخ ایک ہی خاص مقام (کعبہ) کی طرف ہونا چاہیے:

وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ط (البقرہ:۱۴۴۔۱۵۰)

''اور جس جگہ بھی تم ہو اپنے رُخ اسی (کعبہ) کی طرف پھیر لو۔''

کسی کا مسلمان تسلیم کیا جانا موقوف ہے اس بات پر کہ وہ کعبہ ہی کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھے۔

مَنْ صَلّٰى صَلٰوتَنَا وَاسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا وَاَكَلَ ذَبِيْحَتَنَا فَذَالِكَ الْمُسْلِمُ. الخ

(بخاری جلد ۱ صفحہ ۵۶)

ایک ہی خاص مقام کی طرف رُخ کرنے کا ایسا تاکیدی حکم اس حقیقت کے باوجود ہے کہ

نماز جس اللہ کی یاد کا نام ہے وہ ہر جگہ اور ہر طرف ہے، کسی خاص جگہ یا کسی خاص سمت میں محدود نہیں ہے، جیسا کہ خود قرآن نے اس کا اعلان کیا ہے اور واضح ترین لفظوں میں کیا ہے:

فَاَيۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡهُ اللّٰهِ‌ؕ (البقرہ:۱۱۵)

''پس جس طرف بھی تم منہ کرو اللہ اُدھر ہی ہے۔''

(ب) فرض نمازوں کو ــــــــ ان فرض نمازوں کو جو تمام نمازوں کے درمیان فی الواقع اصل نماز ہیں ــــــــ اکٹھے مل کر ادا کرنے کی تاکید فرمائی گئی ہے، اور نماز با جماعت کا ثواب، اس نماز کے مقابلے میں ستائیس گنا بتایا گیا ہے جو اکیلے پڑھ لی گئی ہو۔ (بخاری جلد ۱) نماز کی یہ باجماعت ادائیگی جس حد تک ضروری ہے اس کا اندازہ صرف اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں کے بارے میں، جو کسی عذر کے بغیر نماز با جماعت سے غیر حاضر تھے، فرمایا:

''میرا ارادہ ہوتا ہے کہ کسی کو اپنی جگہ نماز پڑھانے کے لیے مقرر کر دوں، پھر ان لوگوں کے پاس جاؤں جو نماز باجماعت میں حاضر نہیں ہوتے، اور حکم دوں کہ لکڑیوں کے گٹھر ڈال کر ان کے سمیت ان کے گھروں کو پھونک دیا جائے۔'' (مسلم جلد ۱)

یہ اس نبیؐ کے الفاظ ہیں جو رحم و شفقت کا پیکر تھا۔ اس کے باوجود تارکِ جماعت کے بارے میں آپؐ کی زبان سے ایسے سخت اور دہشت بھرے الفاظ کا نکلنا بتاتا ہے کہ باجماعت نماز نہ پڑھنا کوئی معمولی کوتاہی نہیں بلکہ ایک سنگین معصیت ہے۔

(ج) نماز کو اکٹھے مل کر اور باجماعت ادا کرنے کے سلسلے میں صرف اتنی ہی بات کافی نہیں ہے کہ لوگ اپنے گھروں سے نکل کر ایک جگہ جمع ہو جائیں اور پھر اپنے اپنے طور پر اللہ کی یاد میں مشغول ہو رہیں۔ بلکہ ضروری ہے کہ سب لوگ صفیں باندھ کر اور کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوں، اور صفیں تیر کی طرح سیدھی ہوں۔ (بخاری جلد ۱)

پھر سب میں سے ایک اہل تر شخص پوری جماعت کا امام ہو، جو سب کے آگے کھڑا

ہو ——— اور سب لوگ اس کی اقتدا میں یہ فریضہ ادا کریں، اقتدا ایسی کامل ہو کہ پوری جماعت کی ایک ایک حرکت امام کی حرکت کے تابع ہو، پوری جماعت امام ہی کے ساتھ کھڑی ہو، اسی کے ساتھ جھکے، اسی کے ساتھ سجدے میں جائے، اسی کے ساتھ قعدہ کرے، جس وقت وہ قراءت کر رہا ہو پوری خاموشی اور یکسوئی کے ساتھ اس کی سماعت کرے۔ نماز کی ادائیگی میں اگر وہ کسی بھول چوک کا مرتکب ہو رہا ہو تو بھی اُس کی اقتدا سے علیحدگی اختیار کر لینے کی کوئی گنجائش نہیں۔ بس 'سُبْحَانَ اللّٰہِ' کہہ کر اسے اس غلطی پر متنبہ کر دیا جائے۔

یہ دونوں باتیں ——— صف بندی اور امام کی پیروی ——— محض فضائل نماز کا مرتبہ نہیں رکھتیں، بلکہ وہ نمازِ باجماعت کی شرطوں میں داخل ہیں۔ ان میں اگر نقص رہا تو یہ نقص نماز کو بھی ناقص بلکہ بے سود بنا کر رکھ دیتا ہے، اور اس سے صرف آخرت ہی نہیں، دنیا کی زندگی بھی تباہیوں کے خطرات میں جا گھرتی ہے۔ ایک شخص کا سینہ صف سے ذرا باہر نکلا ہوا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تنبیہ فرمائی:

عِبَادَ اللّٰہِ لَتُسَوُّنَّ صُفُوْفَکُمْ اَوْ لَیُخَالِفَنَّ اللّٰہُ بَیْنَ وُجُوْھِکُمْ. (مسلم، جلد ا)

"اللہ کے بندو! اپنی صفوں کو ضرور ہی درست اور سیدھی رکھو، ورنہ اللہ تمھارے رُخ ایک دوسرے کے خلاف کر دے گا۔"

ایک اور موقع پر آپؐ نے فرمایا:

"جو شخص نماز کی کسی صف کو جوڑے گا اُسے اللہ جوڑے گا، اور جو کسی صف کو کاٹے گا اُسے اللہ کاٹ دے گا۔" (ابوداؤد، جلد ا)

اسی طرح امام کی اقتدا کے سلسلے میں آپؐ کا ارشاد ہے کہ:

"جب تم میں سے کوئی شخص امام سے پہلے ہی (مثلاً رکوع سے) اپنا سر اٹھا لیتا ہے تو کیا اسے اس وقت اس بات کا ڈر نہیں رہتا کہ اللہ تعالیٰ اس کے سر کو گدھے کا سر بنا دے گا۔" (مسلم، جلد اول)

(د) نماز کو جماعت کے ساتھ اور ایک امام کی اقتدا میں ادا کرنے کا یہ حکم عام، ظاہر ہے کہ

'محلّہ داری' نوعیت کا ہے۔ یعنی اس حکم کا منشا یہ ہے کہ بستی کے ہر محلے کے لوگ اپنی پانچوں فرض نمازیں اپنے محلے کی مسجد میں باجماعت ادا کریں۔ لیکن اس سلسلے میں شریعت اسی پر بس نہیں کرتی، بلکہ ابھی اور آگے جاتی ہے، اور ہدایت دیتی ہے کہ ہفتہ میں ایک نماز اس طرح پڑھی جائے کہ بستی کے تمام باشندے ایک ہی مسجد میں اکٹھے ہو جائیں، اور پوری بستی ایک جگہ، ایک امام کے پیچھے، ایک ساتھ اپنے رب کے حضور جھکے۔ یہ جمعہ کی نماز ہے۔ اس نماز کی عظمت اور اہمیت سورۂ جمعہ کا نظم کلام یہ بتاتا ہے کہ اُمتِ مسلمہ اپنا فرض منصبی اسی وقت ٹھیک ٹھیک ادا کر سکتی ہے جب کہ اس کا طرزِ فکر و عمل اپنی حقیقی شان کے ساتھ باقی ہو، اور اس طرزِ فکر و عمل کا اپنی حقیقی شان کے ساتھ باقی رہنا جن باتوں پر موقوف ہے ان میں سے ایک یہ نماز جمعہ کی اقامت بھی ہے۔ اگر مسلمانوں نے اس نماز کا حق نہ ادا کیا تو وہ بھی اسی قانونِ خداوندی کی زد میں آ سکتے ہیں جس کی زد میں آ کر پچھلی ملتیں (خصوصاً ملتِ یہود) ذِلت کی موت مر چکی ہیں۔ کچھ ایسی ہی ہدایت اور تنبیہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمائی ہے۔ آپؐ کا صریح ارشاد ہے کہ:

''لوگوں کو جمعہ کی نماز چھوڑنے سے باز ہی آ جانا چاہیے، ورنہ ایسا ضرور ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ان کے دِلوں پر مہر کر دے گا اور پھر وہ حق سے غافل ہو کر رہ جائیں گے۔'' (مسلم، جلد اول)

(۵) نماز میں جو کچھ پڑھنے کی تلقین کی گئی ہے اس میں کثرت سے جمع کے صیغے استعمال کیے گئے ہیں۔

مثلاً اِیَّاکَ نَعۡبُدُ

''خدایا! ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں۔''

اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ

''ہم تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔''

اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ.

''ہمیں سیدھی راہ چلا۔''

رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ

''اے ہمارے پروردگار! حمد تیرے ہی لیے ہے۔''

اَلسَّلامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ.

''سلامتی ہو ہم سب پر اور اللہ کے سارے نیکوکار بندوں پر۔''

وغیرہ ——— اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ نماز ادا کرتے وقت لوگوں کو جس طرح ظاہری طور پر اکٹھے اور صف بستہ ہو رہنے کی ہدایت ہے، اسی طرح ذہنی طور پر بھی باہمی وحدت اور یگانگی کا احساس رکھنے کا حکم ہے۔

یہ امور ایسے ہیں جن کے بغیر نماز، نماز ہوتی ہی نہیں۔ واضح طور پر یہ سب اجتماعی آداب ہیں، اور ان کا منشا اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ نماز کو شعورِ اجتماعیت اور احساسِ نظم و انضباط کا بھی سرچشمہ بنا دیا جائے، مسلمان جس وقت پوری توجہ سے بلکہ اپنے پورے وجود سے اللہ تعالیٰ کی طرف کھنچا ہوا ہوتا ہے اس کے لیے اس وقت بھی ایک جماعت کا جز ہونے کی واقعیت ناقابل فراموش ہو، وہ حضوری کے ان مخصوص ترین لمحات میں بھی اپنے کو ایسا مستقل اور بے ہمہ فرد نہ تصور کرے جو اپنے فرائض، اپنے مقصدِ حیات اور اپنے مفادات کے لحاظ سے دوسرے تمام اہلِ ایمان سے بالکل الگ تھلگ ہو، اور ان فرائض کی تکمیل اور ان مقاصد و مفادات کی تحصیل میں ان سے نہ کوئی ربط رکھتا ہو نہ اس ربط کی کوئی ضرورت محسوس کرتا ہو۔ اس کے بخلاف وہ اپنی دعاؤں اور گزارشوں تک سے بھی یہ حقیقت بار بار نمایاں کرتا رہے کہ اس کے سامنے اپنی انفرادیت کا استقلال بھی ہے اور جماعت کا ناقابل فراموش ارتباط بھی۔ وہ خشکی کا مسافر نہیں ہے کہ اکیلے ہی منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گا، بلکہ کشتی کا مسافر ہے جو عام حالات میں سارے اہلِ کشتی کے ساتھ ہی ساحلِ مراد پر قدم رکھ سکتا ہے۔

اب نماز کے ان سارے اجتماعی آداب کو، اور ان کے پیچھے کام کرنے والے اس منشا کو سامنے رکھ کر اندازہ لگائیے کہ اس عبادت میں اجتماعیت کی رُوح کس زور و قوت کے ساتھ رچا بسا

دی گئی ہے، اور اس سے اسلام میں اجتماعیت کا مقام کتنا عظیم دکھائی دینے لگتا ہے، لیکن یہ اندازہ صحیح اور مکمل نہ ہوگا جب تک کہ نماز کے بنیادی مقصد اور اس کی اصل غرض و غایت سے ان آداب کی مناسبت کا حال بھی نظر میں ہو۔ نماز کی اصل غرض خدا کے دربار کی حاضری اور اس کا ذکر ہے، اور اس ذکر کی جان، دل کا عاجزانہ جھکاؤ ہے۔ یہ دونوں جانی بوجھی حقیقتیں ہیں۔ غور کیجیے کہ نماز کے اس اصل مقصود کو حاصل کرنے کے لیے کون سا مقام زیادہ سازگار ہوسکتا ہے؟ گوشۂ تنہائی یا مجمع عام؟ یادالٰہی کا استغراق، خلوت کا سکون چاہتا ہے یا جلوت کی ہماہمی؟ دل کو خشوع کی دولت زیادہ آسانی کے ساتھ سنسان فضا میں میسر آیا کرتی ہے یا محرومِ سکوت ماحول میں؟ اس سوال کا جواب کوئی شک نہیں کہ صرف ایک ہی ہوگا۔ ہر شخص یہی کہے گا کہ اللہ کی یاد، دل کی کامل یکسوئی چاہتی ہے، اور دل کی کامل یکسوئی، تنہائی کا سکوت مانگتی ہے ——— اب ایک طرف تو نماز کا یہ اصل مقصد، اور اس مقصد کے حاصل ہوسکنے کی یہ مطلوبہ شکل دیکھیے، دوسری طرف شریعت کا یہ فرمان سنیے کہ فرض نمازوں کے لیے اجتماع ضروری ہے اور تنہائی ناقابل معافی جرم، پھر اجتماع بھی اجتماع محض نہیں، بلکہ انتہائی معیاری اور پوری طرح کسا بندھا اجتماع ——— صفیں باندھنا ضروری، صفوں کو تیر کی طرح سیدھا رکھنا ضروری، لوگوں کا اس کا مقتدی ہونا ضروری، امام کی پیروی میں اور اس کے اشاروں کے مطابق ہی سب کا ایک ساتھ کھڑا ہونا، ایک ساتھ جھکنا، ایک ساتھ بیٹھنا، ایک ساتھ سجدہ کرنا اور پھر ایک ہی ساتھ نماز ختم کرنا، سب ضروری!!! بات بظاہر کتنی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ نماز کی اقامت ایسے آداب و شرائط پر موقوف ہو جو دل کی یکسوئی اور باطن کے خشوع میں رہ رہ کر خلل ڈال سکتے ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ آخر ایسا کیوں کیا گیا؟ اور جو چیزیں نماز کے اصل مقصد تک میں خلل ڈال سکتی ہوں انھیں فعلِ نماز کے اندر گوارا ہی نہیں، بلکہ الٹا ضروری تک کیسے قرار دے دیا گیا ہے؟ اس غور و فکر کے بعد آپ جس نتیجہ پر بھی پہنچیں، اس کے اندر یہ حقیقت بھی لازماً داخل ہی ہوگی کہ شارعِ اسلام کو مسلمانوں کے اندر منظم اجتماعیت کا شعور بیدار اور مستحکم رکھنا انتہائی اور غیر معمولی حد تک عزیز تھا، اتنا عزیز کہ نماز کے اصل مقصد تک کے حصول میں

دشواریاں پیدا ہو جانے کے کھلے ہوئے عملی امکان پر اس نے اس شعور کی بیداری اور استحکام کو ترجیح دی[1] بلاشبہ یہ اس امر کی بھی دلیل ہے کہ ملت میں منظم اجتماعیت کے شعور کو بیدار رکھنا بجائے خود اقامتِ نماز کا ایک ذیلی مقصد ہے[2]

---

[1] چنانچہ اس امر پر علما کا اتفاق ہے کہ اگر کسی شخص کو تنہائی میں نماز پڑھنے سے پورا خشوع حاصل ہوتا ہو لیکن جماعت کے ساتھ پڑھنے میں اس کے خیالات اکثر بٹ جایا کرتے ہوں تو بھی اس کے لیے یہ صحیح نہیں ہے کہ فرض نمازیں تنہائی میں ادا کرے اور جماعت کی شرکت چھوڑ دے۔ صرف ایک صاحب، امام غزالیؒ کی رائے اس کے خلاف ہے۔ یعنی انہوں نے جماعت کی شرکت پر خشوع کے حصول کو ترجیح دی ہے۔ مگر ان کی اس رائے کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی ہے۔ (واما افتاء الغزالی فی من یتحقق من نفسہ انہ یخشع فی جمیع صلوٰتہ منفردادون ما اذا صلّٰی فی جماعۃ لتشتت ھمہ بانہ اذا کان الجمع یمنعہ الخشوع فی اکثر صلوٰتہ فالانفراد لہ اولٰی فرد وہ) (حاشیہ مشکوٰۃ: ص۹۶)

[2] اس موقع پر یہ بات بھی یاد دلا دینے کی ہے کہ فرض نمازوں کی باجماعت ادائیگی سے نماز کے اصل مقصد (ذکرِ الٰہی) کے حصول میں اگر خلل اور دشواری پیدا ہونے کے امکانات ہیں تو شریعت نے اس معاملہ کو یوں ہی نہیں چھوڑ دیا ہے، بلکہ تلافی کی صورت بھی تجویز کر دی ہے اور وہ اس طرح کہ جہاں اس نے فرض نمازوں کو ایسے زبردست اجتماعی آداب کے ساتھ ادا کرنے کا حکم دیا ہے، وہیں اس امر کی بھی ترغیب دے رکھی ہے کہ دوسری تمام نمازوں کو مسجد کے بجائے اپنے گھروں میں پڑھا جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: صَلُّوْا اَیُّھَا النَّاسُ فِیْ بُیُوْتِکُمْ فَاِنَّ اَفْضَلَ الصَّلٰوۃِ صَلٰوۃُ الْمَرْءِ فِیْ بَیْتِہٖ اِلاَّ الْمَکْتُوْبَۃَ. (بخاری جلد اول)

"لوگو! نمازیں اپنے گھروں میں پڑھا کرو، کیونکہ سب سے اچھی نماز وہ ہوتی ہے جسے آدمی اپنے گھر میں پڑھتا ہے، سوائے فرض نمازوں کے۔"

چنانچہ خود آپؐ کا اسوہ بھی یہی تھا۔ آپؐ نفل اور سنت نمازیں اپنے حجرے ہی میں پڑھا کرتے تھے۔ آپؐ کے اس ارشاد اور عمل کی سب سے اہم مصلحت واضح طور پر یہی ہے کہ گھر کی تنہائی میں دل کو پوری یکسوئی میسر ہوتی ہے، اس لیے نماز کا اصل مدعا حاصل کرنے کے لیے یہ جگہ زیادہ موزوں اور سازگار ہے۔ اس طرح یہ نفل نمازیں خشوعِ باطن کے حصول کی اس امکانی کسر کا پورا پورا بدل مہیا کر دیتی ہیں جو فرض نمازوں میں جماعت کی پابندیوں کے باعث رونما ہو سکتی ہے۔

اب اگر نماز کی فیض بخشیوں پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالیے تو صاف دکھائی دے گا کہ وہ کامل خیر باطن اور کامل خیر ظاہر، دونوں کی جامع ہے۔ وہ اگر باطن کو حق کی حضوری عطا کرتی ہے تو ساتھ ہی ظاہر کو اجتماعیت کے آداب سے مزین، اور نظم و اتحاد کی قوتوں سے مالا مال بھی کرتی رہتی ہے، اس کے اس فیضان سے خواہ آج کے پیروان اسلام کتنے ہی بے خبر کیوں نہ ہو چکے ہوں، مگر ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جب اسلام کے دشمن بھی اس سے بے خبر نہ تھے۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ:

كَانَ رستم اذارأى المسلمين يَجْتَمِعُوْنَ لِصَّلٰوة يقول اكل عمر كبدى يعلم الكلاب الآداب.

(مقدمہ ابن خلدون، ص۱۳)

"(مشہور ایرانی سپہ سالار) رستم جب میدان جنگ میں مسلمانوں کو نماز کے لیے اکٹھے ہوتے دیکھتا تو کہہ اٹھتا: عمرؓ میرا کلیجہ کھائے جا رہا ہے، وہ کتوں کو آداب سکھا رہا ہے۔"

۲۔زکوٰۃ

نماز کے بعد دوسری اہم ترین عبادت وزکوٰۃ' ہے۔زکوٰۃ کا ادا کرنا اسلامیت کی ان دو بنیادی علامتوں میں سے ایک ہے جو کسی غیر مسلم کے دائرۂ اسلام میں داخل قرار پانے یا نہ پانے کا، سیاسی طور پر فیصلہ کرتی ہیں۔اس عبادت کے سلسلے میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

............اِنَّ اللّٰـهَ افْتَـرَضَ عَـلَيْهِـمْ صَدَقَةً تُوْخَذُ مِنْ اَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَاءِ هِمْ. (مسلم جلد۱)

''اللہ نے مسلمانوں پر زکوٰۃ فرض کی ہے، جو ان کے مال داروں سے لی جاتی ہے اور ان کے ضرورت مندوں پر لوٹا (کر بانٹ) دی جاتی ہے۔''

اس ارشاد نبویؐ سے دو خاص باتیں معلوم ہوئیں: ایک تو یہ کہ اس اہم عبادت کی جو غرض و غایت ہے اس کا ایک رخ (خارجی رُخ) اسلامی معاشرے کے اقتصادی مصالح کی طرف ہے، یعنی یہ جس مقصد سے فرض کی گئی ہے اس کے اندر یہ بات بھی شامل ہے کہ ملت کے حاجت مند افراد اپنی معاشی مجبوریوں اور پریشانیوں سے نبٹنے کے لیے بے سہارا نہ رہ جائیں۔ دوسری یہ کہ طریقہ اس عبادت کا یہ ہے کہ مال زکوٰۃ مال دار مسلمانوں سے لیا اور وصول کیا جائے، اور پھر تنگ حال مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے، یہ نہیں ہے کہ مال دار مسلمان خود ہی زکوٰۃ نکال کر غریبوں کو دے دیا کریں۔ وصول کیے جاتے اور تقسیم کر دیے جانے (تُـوْخَـذُ وَتُـرَدُّ) کی بات چاہتی ہے کہ لازماً کوئی ہاتھ ہو جو وصول کرنے اور تقسیم کرنے کا فریضہ انجام دے۔ واضح طور پر یہ ہاتھ حکومت ہی کا ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کے الفاظ ''وَالْـعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا'' سے معلوم ہوتا اور دورِ نبوی و دورِ خلافتِ راشدہ کے تعامل سے ثابت ہوتا ہے۔ ایک مسلمان کو اپنا مالِ زکوٰۃ حکومت کے حوالے کرنا جس درجہ ضروری ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ عہدِ صدیقی میں جب کچھ لوگوں نے ایسا کرنے سے انکار کیا تو خلیفۂ رسولؐ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کے خلاف تلوار سونت لی، اور پوری عزیمت کے ساتھ فرمایا:

وَاللّٰهِ لَوْ مَنَعُوْنِیْ عِقَالًا کَانُوْا یُؤَدُّوْنَهٗ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ تَقَاتَلْتُهُمْ عَلٰی مَنْعِهٖ. (مسلم جلد ۱، کتاب الایمان)

''خدا کی قسم! اگر ان لوگوں نے اونٹ باندھنے کی ایک رسی کو بھی جسے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کیا کرتے تھے، میرے حوالے کرنے سے روک رکھا تو میں اس کے لیے اُن سے جنگ کروں گا۔''

زکوٰۃ کے متعلق شریعت کے ان دونوں فرمانوں پر نظر ڈالیے۔ صاف محسوس ہوگا کہ اس نے عبادت کو بھی اجتماعیت کا سرچشمہ بنایا ہے۔ ایک طرف تو اس کے مقاصد ہی میں دوسروں کے ساتھ ہمدردی اور مواساتت شامل ہے ـــــ اور یہ وہ عمل اور جذبۂ عمل ہے جو صالح اجتماعیت کا سب سے اہم بنیادی پتھر ہے ـــــ دوسری طرف اس عبادت کے طریق ادا کو اس نے حکومتی نظام کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے ـــــ جو اجتماعیت کی کامل ترین شکل ہے۔ پھر اس نے ایسا اس حقیقت کے باوجود کیا ہے کہ زکوٰۃ کے اصل مقصد اور اس کی بنیادی غرض وغایت کے لیے یہ بات کچھ ناسازگار ہی ہو سکتی ہے، سازگار کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ زکوٰۃ کا اصل مقصد اور اس کی بنیادی غرض وغایت نفس کا تزکیہ ہے۔

تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا. (التوبہ:۱۰۳)

تاکہ اللہ کی رضا حاصل ہو۔

اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰی. (الیل:۲۰)

ظاہر ہے کہ اس مقصد کا تقاضا یہی ہے کہ زکوٰۃ حاجت مندوں کو بطور خود دی جائے، اور اس طرح دی جائے کہ دینے والے کا بایاں ہاتھ بھی یہ نہ جانے کہ دائیں ہاتھ نے کیا اور کسے دیا ہے؟ ورنہ کھلے طور پر، اور وہ بھی حکومت کے اقتدار، نظم، اور ضوابط کے تحت زکوٰۃ دینے کی شکل میں خلوص اور للّٰہیت کے متاثر ہو رہنے کا اندیشہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام نے نماز ہی کی طرح زکوٰۃ کی زبان سے بھی اپنی اجتماعیت پسندی کی شدت کا مظاہرہ کیا ہے۔

کیونکہ عبادات کے اصل اور بنیادی مقصد کے متاثر ہو رہنے کے امکان اور اندیشے پر اجتماعی آداب اور مصالح کو اس نے یہاں بھی ترجیح دے رکھی ہے۔

(۳) روزہ:

تیسری عبادت روزہ ہے۔ یہ ایک ''منفی'' قسم کی عبادت ہے۔ یعنی اس میں نماز یا زکوٰۃ یا حج کی طرح کچھ کیا نہیں جاتا کہ اسے دیکھا جا سکتا ہو، بلکہ کچھ خاص کاموں سے روکا جاتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جس عمل کی نوعیت منفی قسم کی ہو، اس کو اجتماعیت کا جامہ پہنانا دشوار، اور شعورِ اجتماعیت کی بقاو ترقی کا ذریعہ بنانا دشوار تر ہے۔ لیکن روزے کے سلسلے میں شریعت نے جو احکام دیے ہیں ان سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ اُس نے اس منفی عبادت کو بھی اجتماعیت کا ''ہادی'' اور ''معلم'' بنا دیا ہے۔ حکم ہے کہ تمام مسلمان ایک ہی متعین مہینے میں روزے رکھیں، ہر روز تقریباً ایک ہی وقت سحری کھائیں اور پھر ایک ہی متعین وقت پر افطار کریں۔ ان احکام کے نتیجے میں اس عبادت سے جو صورتِ حال وجود میں آتی ہے وہ یہ ہوتی ہے کہ پورا اسلامی معاشرہ مسلسل ایک مہینے تک ایک منضبط تربیتی کیمپ کی شکل اختیار کر لیتا ہے، ایک ہی فضائے عبودیت ہوتی ہے جو مشرق سے مغرب تک چھائی ہوئی ہوتی ہے، ایک ہی حالتِ ضبط و ریاض ہوتی ہے جو فرد فرد کے چہرے سے نمایاں ہوتی ہے۔ کیا وہ معاشرہ جس پر مسلسل ایک ماہ تک ایسی غیر معمولی یکساں ذہنی فضا اور یکساں ظاہری حالت طاری رہے اور جو پورا کا پورا ایک تربیتی کیمپ بنا ہوا ہو، اس کے افراد کے ذہنوں میں یہ تصور رہ رہ کر نہ ابھرتا رہے گا کہ ہم سب ایک ہی مشن کے علم بردار اور ایک ہی محاذ کے سپاہی ہیں؟

بلاشبہ ایک منفی نوعیت کی عبادت کو بھی اس طرح اجتماعیت کا حامل بنا دینا حُب اجتماعیت کے کمال کی دلیل ہے۔

(۴) حج:

اب چوتھی عبادت حج کو لیجیے۔ حج کی غایت یہ ہے کہ اللہ واحد کا پرستار اور معبودِ برحق کا جاں نثار بندہ اس گھر پر حاضری دے جو توحید کا مرکز ہے، جہاں ہر طرف سچی خدا پرستی کے شعائر فداکاری کا

درس دے رہے ہیں، جو موحدِ اعظم حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے ایمان واسلام کی ایک مجسم یادگار ہے ـــــــ حاضری اس لیے دے تاکہ اس کے سر کی آنکھیں اور اس کے دل کی نگاہیں، دونوں ہی اس شہادت گہِ اُلفت کا قریب سے مشاہدہ کرلیں، اور وہ جان لے کہ قولِ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کی عملی تفسیر کیا ہے؟ پھر خدا پرستی کے سے جذبات سچے سرشار ہو کر بندگی کے میدانِ عمل میں ایک نئے جوش کے ساتھ واپس آئے۔

اس عبادت کے ارکان میں سب سے بڑا رکن میدان عرفات کی حاضری ہے۔ یہاں دنیا کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے مختلف نسلوں، قوموں، زبانوں اور رنگوں کے لاکھوں مسلمان اکٹھے ہوتے ہیں۔ ان سب کا ایک امیر حج ہوتا ہے، یہ امیر پورے مجمع کو خطاب کرتا ہے، اور اسے ایمان کے حقائق، اسلام کے مطالبات اور بندگی کے آداب کی تلقین کرتا ہے۔ جو شخص اس اجتماع میں حاضر نہ ہوسکا اس کا حج ادا نہ ہوسکے گا، چاہے اس نے باقی مراسم حج کتنے ہی اہتمام سے کیوں نہ ادا کرلیے ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حج کو بھی نمایاں حد تک اجتماعیت کے قالب میں ڈھال دیا گیا اور شعورِ اجتماعیت کا ایک زبردست ذریعہ بنا دیا گیا ہے۔

اگر غور کیجیے تو دوسری عبادتوں کی طرح یہاں بھی دکھائی دے گا کہ حج کی جو اصل غایت ہے اس کا حصول کسی اجتماع کی ضرورت سے یکسر بے نیاز ہے، یہی نہیں بلکہ بعض پہلوؤں سے وہ اس کے لیے نامساعد بھی ہوسکتا ہے۔ کیونکہ تنہائی کا سکون اور یکسوئی کسی ہنگامۂ اجتماع کے مقابلے میں اس امر کا بہتر موقع فراہم کرسکتی ہے کہ انسان کعبہ اور اطرافِ کعبہ کے شعائر اللہ سے ایمان کی تازگی حاصل کرے۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود شریعت کہتی ہے کہ حج اجتماع کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ گویا دوسرے لفظوں میں وہ یہ کہتی ہے کہ اجتماعیت کی دینی اہمیت بتانے اور ذہن نشین کرانے میں دوسری عبادتوں سے وہ کسی طرح پیچھے نہیں ہے، بلکہ بعض اعتبارات سے ان سب سے آگے ہی ہے۔

اسلام نے اپنی عبادتوں میں جن اجتماعی آداب کو ملحوظ رکھنے کی ہدایت کی ہے ان کی ضروری تفصیل آپ کے سامنے آ چکی، اور ان کے اندر ان آداب کی جو اہمیت ہے وہ بھی آپ ملاحظہ فرما چکے۔ اس کے بعد آپ کا اعتراف اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ ان عبادتوں میں اجتماعیت کی رُوح جس حد تک اتار دی گئی ہے اس کے آگے کسی اور حد کا وجود، عملی امکان سے باہر ہے۔

یہ ہے اجتماعیت کے نقطۂ نگاہ سے اسلامی تعلیمات کے مختلف شعبوں کا جائزہ۔ اس جائزے کے بعد یہ کہنا کسی طرح غلط نہ ہوگا کہ اسلام میں اجتماعیت کو جو بلند ترین مقام عطا کیا گیا ہے اس کی نظیر کسی اور مذہب میں تو کیا، کسی اور نظام میں بھی نہیں پائی جا سکتی۔